غالب کا مابعدالطبیعیاتی شعور

ڈاکٹر محمد نوید ازہر
شعبۂ اُردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ، لاہور

GHALIB'S METAPHYSICAL VISION

Muhammad Naveed Azhar, PhD
Govt. Islamia College, Railway Road, Lahore

Abstract

Ghalib is a philosophical poet of Urdu language. He dealt philosophical questions of life and reality of universe deeply. Although he has not presented a harmonious philosophy like Iqbal but there are many metaphysical elements in his poetry. Ghalib had an astonishing power to explain the philosophical expressions in his verse. *Wahdatul Wujood* is his favourite and prominent topic in this regard. As a follower of Bedil, he composed this concept from different angles. Though he was not a practising Sufi yet he believed in *Wahdatul Wujood* firmly. In the light of this concept he dealt in his verse with ontology, cosmology and psychology nicely.

Keywords:

عبدالرحمٰن بجنوری، فلسفہ، حکمت، تصوف، خواجہ فخر الدین دہلوی، خیام،
حافظ، محمد حسین آزاد، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر شوکت سبزواری

دیوان غالب کے عمیق مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب (۱۷۹۷ء۔۱۸۶۹ء) کا ذہن، اپنی ساخت کے اعتبار سے، اُردو کے تمام شاعروں سے زیادہ فلسفیانہ اور ناقدانہ تھا۔ غالب کے مختصر سے دیوان میں حیرت انگیز تنوع پایا جاتا ہے۔ وہ دقیق سے دقیق مسئلہ کو دو مصرعوں میں بیان کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ جن ناقدینِ ادب نے مشرقی اور مغربی فلسفہ کا بہ نظر غائر مطالعہ نہیں کیا، انہیں غالب کے کلام میں کوئی گہرائی یا فلسفہ نظر نہیں آیا۔ شارحینِ غالب نے غالب کے بہت سے اشعار کو بے معنی بلکہ مہمل تک قرار دے دیا ہے۔ اس کے برعکس جن حضرات کی فلسفہ کے ساتھ طبعی مناسبت ہے، انہوں نے غالب کے اشعار میں سے فلسفہ کے نہایت عمدہ مباحث اور مسائل برآمد کیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے ہاں فلسفہ اور فن دونوں اپنے کمال کو پہنچے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دانتے، ملٹن اور اقبال کی طرح کا فلسفی نہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے حقائق زندگی اور حقائق کائنات کا فلسفیانہ اظہار کیا ہے۔ بنیادی طور پر تو وہ شاعر ہیں لیکن محض شاعر نہیں بلکہ فلسفی شاعر۔ خالص فلسفی کے لیے ضروری ہے کہ حیات و کائنات کے بارے میں وہ اپنے ذاتی نقطۂ نظر کا مالک ہو لیکن فلسفی شاعر کے لیے ایسا ضروری نہیں۔ اس کے لیے پہلے سے موجود کسی فلسفہ کو شعر کے پیرائے میں بیان کر دینا ہی کافی ہے۔ فلسفہ اگر حقائق اشیا کی دریافت کا نام ہے تو شعر اس دریافت کے ان تاثرات کا نام ہے جو شاعر کے دل و دماغ پر منعکس ہوتے ہیں۔ یوں دیوان غالب میں ورق ورق پر بکھرے ہوئے تجربات و احساسات کو دیکھ کر غالب کے فلسفی شاعر ہونے کی حیثیت کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا مابعد الطبیعیاتی شعور اُردو کے تمام شاعروں سے زیادہ یا کم از کم، میر کے بعد سب شاعروں سے زیادہ راسخ ہے۔

اقبال کے برعکس، جو ایک پیغامبر شاعر تھے اور انہوں نے ایک ہی پیغام یا مرکزی فلسفہ کو مختلف تصورات میں ڈھال کر ملتِ اسلامیہ کے بدن میں روح پھونکی؛ غالب نے کسی مرکزی فلسفے کی تکرار نہیں کی، تاہم فکر و فلسفہ کو شعری اظہار سے ضرور آشنا کیا ہے۔ غالب بھی اقبال کی طرح آرزو کے زندہ رہنے کے قائل ہیں اور آرزو سے محروم دل کو دلِ مردہ گردانتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی اس بات میں پوشیدہ ہے کہ آرزو کی شراب دلوں کے آبگینوں سے چھلکتی رہے۔

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ
اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ

مرزا اسد اللہ خاں غالب کے کلام میں فلسفہ، حکمت اور تصوف سمیت موضوعات کی رنگارنگی نظر آتی ہے، جو ان کی ہمہ گیر شخصیت کا پرتو ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے یہ کہتے ہوئے دیوان غالب کو مقدس وید کا ہم رتبہ قرار دیا ہے:

''لوح سے تمت تک مشکل سے سو صفحے ہیں لیکن کیا ہے جو یہاں حاضر نہیں۔ کون سا نغمہ ہے جو اس زندگی کے تاروں میں بیدار یا خوابیدہ موجود نہیں۔''(۱)

غالب نے خیام اور حافظ کی طرح عارفانہ مسائل کو بیان کیا۔ عوام میں صوفی کی بجائے مے خوار کے طور پر شہرت پائی۔ نہ تو وہ درد کی طرح صاحب حال تھے اور نہ ہی میر و آتش کی طرح صوفیانہ خاندانی پس منظر کے مالک۔ تاہم ان کی ذہانت، جودتِ طبع اور ذاتی و سماجی حالات نے مل کر انہیں مابعد الطبیعیات کی طرف راغب کر دیا۔ مولانا حالی نے 'یادگارِ غالب' میں غالب کے حضرت میاں کالے صاحبؒ کے مکان میں رہنے کا ذکر کیا ہے جو دلی کے ایک کامل روحانی بزرگ خواجہ فخر الدین دہلوی کے پوتے تھے۔(۲) محمد حسین آزاد کے بقول ''مرزا کو مولانا فخر الدین دہلویؒ کے خاندان میں بیعت تھی۔''(۳) حالی کے مطابق تصوف سے غالب کو خاص نسبت تھی اور حقائق و معارف کی کتابیں اکثر ان کے زیر مطالعہ رہتی تھیں۔(۴) ڈاکٹر عبادت بریلوی نے غالب کو اُردو کا پہلا فلسفی شاعر قرار دیا ہے۔(۵) البتہ پروفیسر آل احمد سرور کے بقول ''غالب نہ فلسفی تھے، نہ صوفی۔ ان کا سارا فلسفہ اور تصوف ان کی فکر روشن کی کرشمہ سازی ہے۔''(۶) ڈاکٹر شوکت سبزواری کے الفاظ میں ''غالب نے صحیفۂ فطرت اور کتابِ کائنات کے دقیق مطالعے کے بعد اپنے نظریے قائم کیے۔''(۷) سید محمد مصطفیٰ صابری نے 'غالب اور تصوف' میں لکھا ہے: ''غالب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تصوف کے مسائل پر جو بھی شعر کہا ہے اس کی تائید قرآن ورنہ حدیث سے ہوتی ہے۔''(۸)

غالب کے ذہن پر فلسفیانہ افکار کی اس قدر ریلغار ہے کہ ان کے بیان کے لیے الفاظ ناکافی معلوم ہوتے ہیں۔ چناں چہ عبدالرحمٰن بجنوری کہتے ہیں:

''زبان ارضی ہے اور شاعرانہ خیالات سماوی ہیں۔ ان دونوں کو وصل دینا گویا لطیف روح اور مکدر مادہ سے جسم تیار کرنا ہے...... غالب کی شاعری کے جسم پر زبان کا جامہ اسی وجہ سے تنگ ہے۔ یہاں تک کہ بعض جگہ سے چاک ہوگیا ہے اور عریاں بدن اندر سے نظر آتا ہے۔''(۹)

غالب کے ہاں ہندی اور اسلامی فلسفہ کا بہترین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ہندی فلسفہ کے ''ویدانت'' اور اسلامی فلسفہ کے وحدۃ الوجود میں اصل کے اعتبار سے تو کوئی فرق نہیں تاہم ویدانت کے شارحین نے اس کی تعبیرات میں اپنے موقفات شامل کر کے اس میں سے حلول برآمد کر لیا ہے۔ ویدانت کی رو سے بھی وجود صرف ایک ہے، دوسرا کوئی نہیں۔ وحدۃ الوجود والوں کا عقیدہ بھی لاموجود الا اللہ ہے۔ غالب کے اپنے کئی مکتوبات میں اس عقیدے کا برملا اظہار ملتا ہے۔ اسی مماثلت کی بنیاد پر بعض حضرات نے وحدۃ الوجود کو ویدانت سے ماخوذ قرار دینے کی غلطی کی ہے۔ ویدانت اور وحدۃ الوجود دونوں کی رو سے ماسوا اللہ کا وجود حقیقی نہیں بلکہ غیر حقیقی ہے، چاہے اسے مجازی کہا جائے چاہے ظلّی۔ وجود حقیقی صرف ذاتِ باری تعالیٰ کا ہے۔ باقی تمام اشیائے کائنات کا وجود اگر چہ ہست ہے تاہم وجود باری تعالیٰ کے اعتبار سے نیست یا عدم کے حکم میں ہے اس بات کی وضاحت کے لیے ماہتاب کی مثال پیش کی جا سکتی ہے، جو بظاہر تو منور نظر آتا ہے لیکن اس کا نور آفتاب کے نور سے ماخوذ ہے۔ آفتاب کے بغیر ماہتاب کی کوئی حیثیت نہیں۔ اسی طرح صوفیہ کے نزدیک عالم محسوس کی فانی زندگی لہو ولعب (کھیل اور تماشا) ہے جبکہ عالم آخرت دارالبقا ہے۔ عالم آخرت کے مقابلے میں عالم دُنیا کی حیثیت فنا اور مایا (فریب) ہے، یا اصطلاحاً اعتباری ہے اس لحاظ سے اسے معدوم بھی کہا جا سکتا ہے۔ غالب نے کائنات کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا وہ ویدانتی ''مایا'' اور قرآنی تصور فنا سے اخذ کردہ ہے:

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستی اشیاء مرے آگے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے؟ اے نہیں ہے

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ بادِ یاں

وحدۃ الوجود کی رو سے کائنات ذاتِ باری تعالیٰ سے جدا ہو کر کوئی وجود نہیں رکھتی۔ جیسے ماہتاب سے جدا ہو کر کسی حیثیت کا مالک نہیں۔ وجودِ حقیقی اور کائنات میں ذات وصفات کی نسبت ہے۔ چوں کہ صفات عینِ ذات ہیں اس لیے کائنات حق تعالیٰ سے جدا نہیں۔ اصل حقیقت ایک ہی ہے، جو موجودات کی کثرت میں اپنے آپ کو ظاہر کر رہی ہے۔ یوں موجودات کی حیثیت ظلّی ہے۔ ویدانت، وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود سب میں اصل کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں بلکہ فروعی اعتبار سے اختلاف ہے۔ جس کی طرف فخر الدین عراقی نے اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

عِبَارَاتُنَا شَتّیٰ وَ حُسْنُکَ وَاحِدٌ
وَکُلٌّ اِلٰی ذَاکَ الْجَمَالِ یُشِیْرُ (۱۰)

یعنی ہماری تعبیرات طرح طرح کی ہیں جبکہ تیرا حسن ایک ہی ہے۔اور ان میں سے ہر ایک تعبیر اسی حسن وجمال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

قطرہ،موج،حباب سب بے حقیقت ہوکر وجودِ بحر کے خارجی مظاہر ہیں۔غالب اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

ہے مشتمل نمود صُور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

شاہد ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

وحدۃ الوجود یا ہمہ اوست غالب کا خاص موضوع ہے۔غالب نے وحدۃ الوجود کے بارے میں اپنے مفصل خیالات اور ابن عربیؒ سے اپنی عقیدت کا اظہار ''میر سید علی خان بہادر غمگین عرف حضرت جی'' کے نام اپنے فارسی مکتوبات میں کیا ہے۔ان مکتوبات سے حضرت جی کے ساتھ غالب کی عقیدت بھی عیاں ہے۔ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''حدیث کے مطابق حقیقتِ واحدہ کے ماننے والے کسی چیز کو موجود نہیں مانتے۔رخِ نیاز جس طرف بھی کریں اس جماعت کی آنکھ اس ہی بنیادی حقیقت

پر کھلی ہے اور لا موثر فی الوجود الا اللّٰہ ولا موجود الا اللّٰہ یعنی نہیں موجود کوئی سوائے اللہ کے۔''(۱۱)

غالب کے وجودی ہونے کے بارے میں حالی لکھتے ہیں:

''مرزا اسلام کی حقیقت پر نہایت پختہ یقین رکھتے تھے اور توحید وجودی کو اسلام کا اصل اصول اور رکن رکین جانتے تھے۔ اگر چہ وہ بظاہر اہل حال سے نہ تھے مگر جیسا کہ کہا گیا من احب شیئاً اکثر ذکرہٗ توحید وجودی ان کی شاعری کا عنصر بن گئی تھی۔ اس مضمون کو انھوں نے جس قدر اوصاف سخن میں بیان کیا ہے غالباً نظیری اور بیدل کے بعد کسی نے بیان نہیں کیا...... انھوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں صرف دو چیزیں لے لی تھیں۔ ایک توحید وجودی اور دوسرے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اہل بیت کی محبت اور اسی کو وہ وسیلہ نجات سمجھتے تھے۔''(۱۲)

حیاتِ دنیوی کی ابتدا اور انتہا ذات باری تعالیٰ کے وجود سے ہے۔ وہ وجود مطلق ہے۔ ھو الاول و الاخر و الظاھر و الباطن۔(۱۳) وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ کائنات کا وجود چونکہ اعتباری اور اضافی ہے لہٰذا زندگی سرچشمۂ اصلی سے جدا ہو کر ہی ممکن ہے۔ جیسے ماہتاب کی ہستی اور اپنی روش اس کے آفتاب سے جدا ہونے میں پوشیدہ ہے۔ بعینہٖ دنیوی حیات یا ہستی نے ہمارے اور وجود مطلق کے درمیان جدائی پیدا کر دی ہے اور ہمیں وطنِ اصلی سے دور کر دیا ہے۔ غالب اس بات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

یوں ہماری ہستی درحقیقت نیستی ہے، ہمارا شعور دراصل بے شعوری ہے اور ہمارا بیدار رہنا بذاتِ خود ایک عالمِ خواب سے عبارت ہے:

ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

عقیدہ وحدۃ الوجود پر غالب کو کامل یقین ہے۔ ان کے نزدیک منظر، ناظر اور منظور، سب کی اصل ایک ہے۔ عالم اور معلوم، شاہد اور مشہود میں کوئی امتیاز موجود نہیں۔ لیکن اس بات پر انہیں حیرت بھی ہے کہ جب تمام اشیائے کائنات ایک ہی ذاتِ حق کی مظہر ہیں تو پھر مشاہدہ کیا چیز ہے؟ گویا دیکھنے والا خود ہی کو دیکھتا ہے۔

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

صوفیائے کرام کے نزدیک کائنات اور اس کے تغیرات ذاتِ مطلق کے شیونات (Manifestations) ہیں۔ یہ سب ذاتِ واحد کے جلوے ہیں۔ "ھو کل یوم ھو فی شان" (۱۴) کے تحت ہر لحظہ نئی شان وشوکت سے جلوہ گر ہے۔ یوں عالم مادی کے تمام تغیرات شاہدِ حقیقی کی ذات کے لیے مظاہر کا درجہ رکھتے ہیں۔ کائناتِ ہست وبود کا ذرہ ذرہ آفتابِ وجود کے نور سے منور ہے۔ شعاعیں جب تک آفتاب میں ہیں ان میں کثرت موجود نہیں۔ لیکن آفتاب سے جدا ہو کر ان میں تعدد اور تکثر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ معنی بھی نکلتا ہے کہ کائنات وسعت پذیر ہے۔ تکمیل آشنا نہیں کیونکہ یہ حسنِ مطلق کا پرتو ہے اور حسنِ مطلق ماند نہیں پڑسکتا۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

حسنِ مطلق کے جمال جاں نواز سے لذت یاب ہونے کے لیے، قطرہ میں دریا، ذرہ میں

خورشیداور جزو میں کل دیکھنے کے لیے دیدۂ دل کو وا کرنا شرط ہے۔ غالب کہتے ہیں:

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اس کائنات کا وجود ذوقِ نمود کے باعث ہے۔ ذات باری حسن ہے اور حسن اظہار چاہتا ہے۔ چناں چہ کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الخَلْق(۱۵) کے تحت معرفت کی خواہش نے عالم اشیا کو عدم سے وجود بخشا۔ یوں یہ کائنات ایک آئینہ ہے جس میں ذاتِ احدیت اپنے حسن وجمال کا مشاہدہ کر رہی ہے۔ غالب کے الفاظ میں:

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خودبیں

کائنات کی کثیف اشیا آئینۂ فطرت کو آئینہ بنانے کے لیے قلعی (Polish) کا کام کر رہی ہیں۔ آئینے کی ایک سطح اگر کثیف نہ ہو تو اس میں عکس پیدا نہیں ہوتا اور نظر آر پار ہو جاتی ہے۔ چناں چہ اس کائنات میں بطور پس منظر کے کچھ کثافت بھی پیدا کی گئی تا کہ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً(۱۶) کے تحت خیر وشر اور حسن وقبح میں امتیاز پیدا ہو۔ غالب کہتے ہیں:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اگر ذاتِ حق عالم تنزیہ میں ہو، یعنی پردے میں ہو، تو ذہن انسانی اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ فہم انسانی میں آنے کے لیے اس کا مرتبہ تشبیہ میں ظاہر ہونا ضروری ہے۔ چناں چہ ذاتِ حق نے انسانی ذہن میں اپنا تصور پیدا کرنے کے لیے خود کو مرتبہ تشبیہ میں ظاہر فرمایا۔ لیکن جب وہ ذات مرتبہ تنزیہ میں ہوتی ہے تو فہم وادراک سے ماورا ہوتی ہے۔ بے مثل و بے مثال اور بے چون و بے چگون ہوتی ہے۔ غالب کے بقول:

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

ذات پاک کو صرف صفات کے پردے ہی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ چناں چہ یہ ساری کائنات اسی حسنِ مطلق کی جلوہ گری ہے، جو اس کی ذات کے لیے ایک پردہ بن گئی ہے۔یوں ''الظاہر'' کی شان کے باوجود وہ ''الباطن'' بھی ہے۔غالب کے لفظوں میں:

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

قرآنی تصور کے مطابق کائنات فانی، بے ثبات اور ناپائدار ہے۔اس کا صوفیانہ مفہوم یہ ہے کہ کائنات اور کائنات کی تمام اشیا مسلسل حرکت میں ہیں اور اس حرکت کے نتیجے میں وہ ایک کیفیت سے دوسری کیفیت میں منتقل ہوتی رہتی ہیں جس منزل کو وہ ایک مرتبہ ترک کر دیتی ہیں، دوبارہ لوٹ کر اس کی طرف نہیں آتیں۔یوں ایک صورت فنا سے دوچار ہے تو دوسری وجود میں آرہی ہے۔کائنات کے پس پردہ یہی اصول کارفرما ہے۔ارشادِ ربانی ہے:

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۱۷)

ترجمہ: ''اورتم کیسے انکار کرتے ہو اللہ کا، حالاں کہ تم مردہ تھے، پھر اس نے تمھیں زندہ کیا، پھر وہ تمھیں مارے گا، پھر زندہ کرے گا، پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

نیستی چوں کہ ایک نئی ہستی کے حصول کا ذریعہ ہے، اس لیے یہ بھی ایک نعمتِ خداوندی ہے۔غالب کہتے ہیں:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

کائناتِ رنگ و بو کی رنگینی اسی فنا کے عمل کی بدولت ہے۔یہی وہ فنا ہے جو بقا کی ضامن ہے۔خود انسانی بدن کے اندر بے شمار خلیات (Cells) آنِ واحد میں فنا سے دوچار ہوتے اور انسان کو حیاتِ نو سے ہم کنار کرتے ہیں۔علاوہ ازیں ہم میں سے ہر شخص آج وہ نہیں جو وہ اپنے بچپن میں تھا، نہ

ذہنی کیفیت کے لحاظ سے اور نہ ہی عادات واطوار کے حوالے سے؛ اسی طرح جوانی والا انسان بڑھاپے میں جا کر بدل جاتا ہے اور جوانی کے عالم سے یکسر مختلف ہو جاتا ہے۔ ایک گذشتہ کیفیت کا زوال ہمیں ایک نئی صورت کا کمال عطا کرتا ہے۔ ایک کیفیت کے زائل ہو جانے سے ہم دوسری کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ پھر، بہار کے ساتھ خزاں، دن کے ساتھ رات، دھوپ کے ساتھ چھاؤں اور زندگی کے ساتھ موت اسی اصول کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسی آفاقی اصول سے برقِ خرمن کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے۔

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

کائنات کا ذرہ ذرہ گردشِ روز وشب کا اسیر ہے۔ وہ کسی ابدی نشے میں سرشار ہو کر کسی لامتناہی منزل کی طرف گرم سفر ہے۔ مرکزہ (Neuclius) کے گرد گھومنے والا ہر الیکٹران فراق میں تڑپ رہا ہے اور اپنے مرکز سے وصال کے لیے مسلسل کوشش کر رہا ہے۔ جب تک یہ وصال اسے میسر نہیں آتا، اس کی حرکت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اگر یہ ابدی سفر طے ہو جائے تو زندگی موت میں تبدیل ہو جائے۔ یہ فنا، بقا کا راستہ ہموار کرتی ہے۔ محبوبِ حقیقی جب کسی عاشقِ صادق کے لیے اپنی ذات کو بے حجاب کرتا ہے اور دشتِ جدائی میں سفر کرنے والے آبلہ پا کو لذتِ وصال میسر آجاتی ہے تو یہ اس کی بقا ہوتی ہے جیسے قطرہ دریا میں مل کر قطرہ نہیں رہتا بلکہ دریا بن جاتا ہے۔ غالب کہتے ہیں:

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

غالب کا اختصاص یہ ہے کہ وہ وصال میں بھی انفرادیت کے زوال کے قائل نہیں کیوں کہ بعد از وصال اگر ترقی کا سلسلہ رُک جائے تو اس سے بھی فنا یا موت لازم آتی ہے اور یہ ارتقا کے خلاف ہے۔تبھی تو وصال کے بعد بھی صوفی کا ارتقا جاری رہتا ہے۔ وصال ربانی کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ ہر منزل پر پہنچ کر اس سے اعلیٰ منزل تک رسائی حاصل کرنے کی تڑپ دل میں موج زن رہتی ہے۔ غالب یہ نہیں کہتے کہ قطرہ دریا میں مل جانے کے بعد فنا ہو جاتا ہے یا اس کا والہانہ ذوق وشوق سرد پڑ جاتا ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک شوق کا سرد پڑ جانا تو درکنار، اس میں کمی تک واقع نہیں ہوتی۔ جیسے موجیں دریا کے محیط میں اُٹھتی ہیں لیکن ایک مسلسل اضطراب کی غماز ہوتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں یہ اشعار:

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موج، محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

———

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

———

نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا
حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

وصول الی اللہ کی منزل کا حصول جتنا دشوار ہے اور ایک سالک کو اس کے لیے جس قدر ریاضت ومشقت سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس سے بھی غالب بے خبر نہیں۔ کہتے ہیں:

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

غالب عظمتِ انسانی کے قائل ہیں۔ وحدۃ الوجود کے قائل ہونے کی وجہ سے بھی اور اپنے

عہد میں مغل دور کی عظیم تہذیب کی شکست وریخت کے احساس کی وجہ سے بھی، جس کی تعمیرِ عظمت انسانی کے شعور کو بیدار کرنے میں بھی مضمر تھی۔ انسان تخلیق کائنات کا شہکار ہے۔ خالق کائنات نے اس میں قوت بہیمیہ بھی پوشیدہ رکھی ہے، جس کے تحت اس میں چوپایوں جیسی صفات پائی جاتی ہیں اور قوت ملکیہ سے بھی اسے متصف فرمایا ہے، جس کے سبب وہ عرش معلّٰی کی بلندیوں پر محو پرواز ہوسکتا ہے۔ انسان میں موجود شہوت اور غضب کی قوتیں ایسی ہیں کہ اگر عقل سلیم ان پر نگران نہ ہوتو انسان کو وحوش و بہائم کی اسفل سطح پر لے جاتی ہیں۔عظمت انسانی ان ملکات کے اعتدال میں پوشیدہ ہے۔ جو انسان شر کی قوت پر خیر کی قوت کو اور شیطانی صفات پر رحمانی صفات کو غالب کرلے وہ معرفت وعبادت کے ذریعے قرب الٰہی کے درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ یہی چیز انسان کا مرتبہ ملائکہ سے بلند کردیتی ہے۔ لیکن یہ ایک امر دشوار ہے:

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

غالب انسان کی پستی اور ذلت پر یوں نوحہ کناں ہیں:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

غالب نے تقدیر کا فلسفہ بھی بالکل منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ 'تقدیر' کا لغوی معنی 'اندازہ' ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ کائنات سے پہلے کائنات کا ایک اندازہ لگالیا یا ایک خاکہ اپنے علم میں مرتب کرلیا۔ اسی کو تقدیر کہتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

وَ كُلُّ شَيءٍ عِندَهُ بِمِقْدَار (۱۸)

یعنی اور اس کے نزدیک ہر چیز کا ایک اندازہ ہے۔

تقدیر کا لوح محفوظ پر تحریر ہونا ان معنوں میں نہیں کہ انسان اس پر مجبور کردیا گیا ہے بلکہ ان معنوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اندازہ مقرر کرلیا ہے کہ کون شخص اپنی زندگی میں کس توفیق کا مالک

ہوگا۔ 'توفیق' انسان کے ارادے کو کہتے ہیں جو خالق کے ارادے کے موافق ہو جائے۔ روزِ ازل اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ کون سا شخص کتنی ہمت رکھتا ہے۔ اسی چیز کو تقدیر کا نام دیا گیا۔ ایک قطرہ آنکھ کا آنسو بنا، دوسرا قطرہ صدف کی آغوش میں پرورش پانے والا گوہر بنا۔ دونوں کی تقدیر دونوں کی ہمت کے مطابق تھی۔ غالب کا شعر ملاحظہ ہو:

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

دُعا کے بارے میں بھی غالب کا نقطۂ نظر خالص صوفیانہ ہے۔ اکثر راضی برضا صوفیہ زبانِ قال سے سوال نہیں کرتے بلکہ فرماتے ہیں کہ سب کچھ اللہ کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ دُعا کی ضرورت ہی نہیں۔ یوں انہوں نے اپنی رضا کو محبوبِ حقیقی کی رضا میں گم کر دیا ہوتا ہے۔ یہ چوں کہ ان کا حال ہے اس لیے اس پر شریعت کی گرفت بھی نہیں۔ دوسرے صوفیہ جو قرآن وحدیث کے احکام کے پیشِ نظر دُعا مانگنے کو ضروری سمجھتے ہیں، وہ اس کے لیے یقینِ اجابت کو شرط قرار دیتے ہیں۔ یقینِ اجابت سے مراد یہ ہے کہ قبولیت کا یقین رکھتے ہوئے دُعا مانگی جائے۔ غالب کہتے ہیں اگر تجھے یقین ہے کہ تری دُعا ضرور قبول ہوگی تو دُنیا کے لیے کوئی دُعا نہ مانگ، کیونکہ یہ خود بھی فانی ہے اور اس کی راحتیں بھی۔ اللہ تعالیٰ سے ایسا دل طلب کر جس میں اس کی طلب کے سوا کوئی طلب پیدا نہ ہو۔ یعنی ''دلِ بے مدعا'' مانگ لے۔ اس طرح غالب دُعا مانگنے سے منع نہیں کرتے بلکہ دنیوی دُعا سے منع کرتے ہیں۔ یہ نظریہ صوفیہ کے عقیدے **لا موجود الا اللّٰہ. لا مقصود الا اللّٰہ، لا مطلوب الا اللّٰہ** کے عین مطابق ہے۔ غالب کا شعر یوں ہے:

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دُعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

غالب وسیع المشربی میں بھی اخلاص کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان جو راستہ بھی اختیار کرے اس پر صدقِ دل سے کاربند رہے۔ اس میں مذہب وملت کی قید نہیں۔ کافر وہ نہیں جو منکرِ خدا یا

صنم پرست ہے، بلکہ وہ ہے جو وفاداری اور استواری کے ساتھ اپنے عقیدے پر قائم نہیں رہتا۔تشکیک اورتذبذب کاشکار ہے۔غالب کےنزدیک مذہب ظاہری رسوم سے بالاتر ہونے اورعمل میں خلوص پیدا کرنے کانام ہے۔وہ کہتے ہیں:

وفا داری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

یوں غالب کامختصر سا دیوان ان تمام موضوعات کا احاطہ کرتا ہے جن کاتعلق مابعد الطبیعیات کےموضوع سے ہے۔وہ مذہبی اورصوفیانہ مسائل کواس انداز سے فلسفے میں ڈھال لیتے ہیں کہ اس سے ان کے گہرے مابعد الطبیعیاتی شعور کی نشان دہی ہوتی ہے۔اس ضمن میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی رائے بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ ''غالب کے یہاں فلسفیانہ خیالات کی بہت سی تہیں ملتی ہیں۔''(۱۹) دیوانِ غالب میں موجودفلسفیانہ ومابعد الطبیعیاتی مسائل کاتنوع غالب کواُردوغزل کا شاعرِ فلسفی ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی وحوالہ جات

(۱)عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر، محاسن کلام غالب، ڈاکٹرعبدالرحمٰن بجنوری ٹرسٹ اسلام آباد، دوم،۲۰۰۴ء، ص:۱

(۲)حالی، الطاف حسین، یادگارِغالب، دارالادب چوک مینارانارکلی لاہور، س۔ن، ص:۴۰

(۳) آزاد،محمد حسین، آبِ حیات، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۱ء، ص:۴۰۹

(۴)حالی، الطاف حسین، یادگارِغالب، محولہ بالا، ص:۱۷

(۵)عبادت بریلوی، ڈاکٹر، غزل ومطالعہ غزل، انجمن ترقی اُردوپاکستان، ۱۹۵۵ء، ص:۵۶۳

(۶)آل احمد سرور، نئے اورپرانے چراغ، اُردواکیڈمی سندھ کراچی، ۱۹۵۷ء، ص:۱۷۶

(۷) شوکت سبزواری، ڈاکٹر، فلسفہ کلام غالب، انجمن ترقی اُردو کراچی، ۱۹۶۹ء، ص: ۱۱۴

(۸) محمد مصطفیٰ صابری، سید، غالب اور تصوف، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۹۰ء، ص: ۱۸

(۹) عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر، محاسن کلام غالب، محولہ بالا، ص: ۶

(۱۰) عراقی، فخر الدین، لمعات، مشمولہ: کلیات عراقی، مرتب: سعید نفیسی، از انتشارات کتابخانہ سنائی، چہارم، ص: ۳۸۲

(۱۱) پرتو روہیلہ، غالب کے منتخب فارسی مکتوبات، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص: ۲۱۴

(۱۲) حالی، الطاف حسین، یادگار غالب، محولہ بالا، ص: ۹۰۔۹۱

(۱۳) الحدید ۵۷: ۳، ترجمہ: ''وہی اوّل ہے اور آخر ہے اور ظاہر ہے اور باطن ہے''۔

(۱۴) الرحمٰن ۵۵: ۲۹، ترجمہ: ''ہر لحظہ وہ ایک نئی شان سے جلوہ گر ہے''۔

(۱۵) حدیث قدسی: ترجمہ: ''میں ایک مخفی خزانہ تھا۔ میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں، سو میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔''

(۱۶) الملک ۶۷: ۲، ترجمہ: ''تا کہ آزمایا جائے کہ تم میں سے اچھا عمل کون کرتا ہے''۔

(۱۷) البقرہ ۲: ۲۸ (۱۸) الرعد ۱۳: ۸

(۱۹) اسلوب احمد انصاری، پروفیسر، غالب کی شاعری کے بنیادی عناصر، سالنامہ ادب لطیف لاہور، اپریل ۱۹۵۶ء، ص: ۲۹